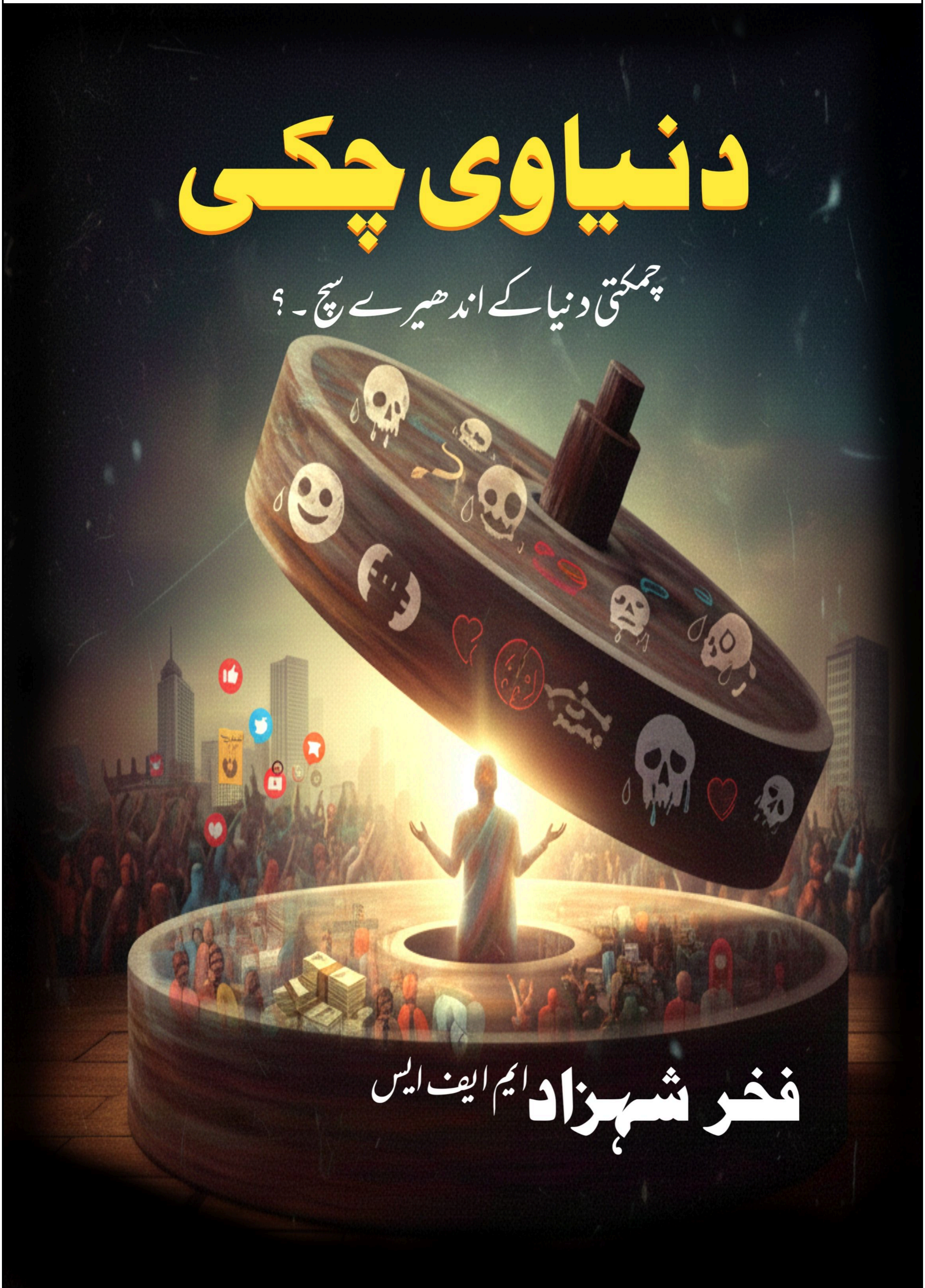

دنیاوی چکی
چمکتی دنیا کے اندھیرے سچ۔؟
فخر شہزاد ایم ایف ایس

کتاب

دنیاوی چکی

مصنف

فخر شہزاد ایم ایف ایس

انتساب

میں اپنی اس کاوش کو منسوب کرتا ہوں:

اُن تمام پیاسی روحوں کے نام، جو اس مادی دنیا کے شور میں اپنی حقیقت تلاش کر رہی ہیں۔

اپنے والدین کے نام، جن کی دعاؤں نے میرے لفظوں کو زندگی بخشی۔

اور ہر اُس شخص کے نام، جو اس "دنیاوی چکی" میں پسنے کے باوجود اپنے ضمیر کا چراغ بجھنے نہیں دیتا۔

عرضِ مؤلف

"دنیاوی چکی" کوئی افسانوی داستان نہیں بلکہ میرے ان مشاہدات کا نچوڑ ہے جو میں نے اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے معاشرے سے اخذ کیے۔ میں نے دیکھا کہ ہم ترقی کی دوڑ میں اتنے آگے نکل گئے کہ خود کو پیچھے چھوڑ آئے۔ ہم نے گھر تو بڑے بنا لیے مگر ظرف چھوٹے کر لیے۔ یہ کتاب دراصل ایک دستک ہے، اُس سوئے ہوئے احساس کے دروازے پر جو ہم سب کے اندر موجود ہے مگر مصلحتوں کے تالوں میں بند ہے۔ میری کوشش صرف اتنی ہے کہ ہم ان تلخ حقائق کا سامنا کر سکیں جنہیں ہم روز مرہ کی مصروفیت میں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

پیش لفظ

کسی بھی کتاب کا مقصد صرف معلومات فراہم کرنا نہیں ہوتا بلکہ قاری کے اندر ایک سوال پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ کتاب "دنیاوی چکی" نو مختلف ابواب کے ذریعے انسانی نفسیات، معاشرتی زوال، اور روحانی خلا کی عکاسی کرتی ہے۔ ہم کیوں نیک نظر آنا چاہتے ہیں؟ ہمارا علم شعور میں کیوں نہیں ڈھلتا؟ ہم نے محبت اور عبادت کے تصورات کو کیوں مسخ کر دیا؟ ان صفحات میں آپ کو ان سوالوں کے جواب شاید نہ ملیں، لیکن آپ کو وہ آئینہ ضرور ملے گا جس میں آپ اپنا اور اپنے معاشرے کا اصل چہرہ دیکھ سکیں گے۔ یہ کتاب ایک سفر ہے، ظاہر سے باطن کی طرف، اور مادی ہوس سے روحانی سکون کی طرف۔

فہرست

ہم نیک کیوں نظر آتے ہیں، ہوتے کیوں نہیں؟

تمہید: نمائش کا دور

آج کے دور میں نیکی ایک عمل سے زیادہ ایک "لباس" بن چکی ہے۔ ہم سب نے اپنے اوپر پارسائی کی ایک ایسی چادر اوڑھ رکھی ہے جس کا مقصد خدا کو راضی کرنا نہیں بلکہ بندوں کی نظر میں معتبر ٹھہرنا ہے۔ یہ اس "دنیاوی چکی" کا پہلا پاٹ ہے جو ہماری روح کو پیس رہا ہے۔ ہم نے کردار کی تعمیر چھوڑ کر تاثر (Impression) کی تعمیر شروع کر دی ہے۔

دکھاوے کی نفسیات

نیک نظر آنا بہت آسان ہے، لیکن نیک ہونا ایک کٹھن سفر ہے۔ نیک نظر آنے کے لیے صرف چند مخصوص الفاظ، مخصوص حلیہ اور مناسب وقت پر مناسب جملے ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن نیک ہونے کے لیے اپنے اندر کے فرعون کو مارنا پڑتا ہے، اپنی انا کی قربانی دینی پڑتی ہے اور تنہائی میں بھی وہی ہونا پڑتا ہے جو ہم محفل میں ہوتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اخلاق کو "سوشل میڈیا فیڈ" بنا دیا ہے جہاں صرف وہی حصہ دکھایا جاتا ہے جو خوبصورت ہو۔

منافقت کا سماجی قبول عام

معاشرہ اب سچائی کا طلبگار نہیں رہا، اسے صرف "اچھی تصویر" چاہیے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنے والا، ملاوٹ کرنے والا یا دھوکہ دینے والا شخص صرف مذہبی حلیہ اپنا کر یا چند خیراتی کام کر کے "نیک" کہلانے لگتا ہے، تو ہم بھی اسی راہ پر چل نکلتے ہیں۔ ہم نے نیکی کو روح کے بجائے رسومات میں مقید کر دیا ہے۔ ہم مسجد کی پہلی صف میں تو نظر آنا چاہتے ہیں لیکن کسی غریب کے دکھ میں اس کے پہلو میں بیٹھنا ہمیں اپنی توہین لگتا ہے۔

خوفِ خدا بمقابلہ خوفِ خلق

ہماری نیکی کا محور بدل چکا ہے۔ ہم اس لیے گناہ سے نہیں بچتے کہ ہمارا رب دیکھ رہا ہے، بلکہ اس لیے بچتے ہیں کہ "لوگ کیا کہیں گے"۔ جس دن انسان کے دل سے خدا کا خوف نکل کر لوگوں کا ڈر بیٹھ جائے، اس دن وہ نیک نظر آنے کی کوشش تو کرے گا لیکن نیک بننے کی تڑپ کھو دے گا۔ اصل نیکی وہ ہے جو تب بھی قائم رہے جب کوئی دیکھنے والا نہ ہو، جب کوئی تالی بجانے والا نہ ہو اور جب کوئی واہ واہ کرنے والا نہ ہو۔

نتیجہ فکر
ہمیں اس دنیاوی چکی سے نکلنے کے لیے اپنے ظاہر اور باطن کے درمیان موجود خلیج کو بھرنا ہوگا۔ نیکی کوئی سرٹیفکیٹ نہیں جو معاشرہ ہمیں دے گا، بلکہ یہ وہ سکون ہے جو اللہ ہمارے دل میں اتارتا ہے۔ جب تک ہم اپنی نیتوں کی صفائی نہیں کریں گے، ہم صرف مٹی کے وہ برتن بنے رہیں گے جو باہر سے تو چمکدار ہیں لیکن اندر سے خالی اور گندے ہیں۔

علم بڑھا، شعور کیوں نہ بڑھا؟

علم اور شعور کا فرق

ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں معلومات کی فراوانی ہے، لیکن دانائی کا قحط۔ ہماری لائبریریاں کتابوں سے بھر گئیں، انٹرنیٹ نے دنیا بھر کا علم ہماری انگلیوں کی پوروں پر لا رکھا، لیکن انسانی رویوں میں تلخی اور سوچ میں پستی آتی گئی۔ علم معلومات کا مجموعہ ہے، جبکہ شعور اس علم کو زندگی میں برتنے کا سلیقہ ہے۔ علم ہمیں "بتاتا" ہے کہ سچ بولنا اچھی بات ہے، لیکن شعور ہمیں سچ بولنے کی "توفیق" دیتا ہے۔

ڈگریوں کا بوجھ اور خالی ذہن

جدید تعلیمی نظام نے ہمیں ماہرِ فن تو بنا دیا، لیکن انسان بنانا بھول گیا۔ ہم ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل تو بن گئے، لیکن ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جو دوسروں کے دکھ کو محسوس کر سکیں۔ ہم نے ڈگریوں کو کامیابی کا معیار بنا لیا، لیکن کردار کی ڈگری کہیں کھو گئی۔ جب علم صرف روزگار حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے، تو وہ دماغ کو تو روشن کر سکتا ہے، مگر روح کو منور نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی اکثر تعصب، نفرت اور تنگ نظری کا شکار نظر آتا ہے۔

معلومات کا سیلاب اور فکری جمود

آج کا انسان ہر چیز کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہے، لیکن کسی بھی چیز کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتا۔ ہم نے مطالعہ چھوڑ کر "اسکرولنگ" (Scrolling) کو علم سمجھ لیا ہے۔ شعور تب پیدا ہوتا ہے جب انسان علم پر غور و فکر کرتا ہے، جب وہ سوال کرتا ہے اور جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے۔ دنیاوی چکی نے ہمیں اتنا مصروف کر دیا ہے کہ ہمارے پاس خود سے ملنے کا وقت ہی نہیں رہا۔ جہاں سوچنے کا عمل رک جائے، وہاں شعور کی نمو بھی تھم جاتی ہے۔

شعور کی کمی کے سماجی اثرات

جس معاشرے میں علم ہو مگر شعور نہ ہو، وہاں بحث زیادہ اور مکالمہ کم ہوتا ہے۔ وہاں لوگ دوسروں کی غلطیاں تو ڈھونڈ لیتے ہیں، لیکن اپنی اصلاح کرنا بھول جاتے ہیں۔ شعور انسان کو عاجزی سکھاتا ہے، جبکہ صرف علم اکثر انسان میں تکبر پیدا کر دیتا ہے۔ ہم نے آسمانوں تک پہنچنے کے راستے تو تلاش کر لیے، لیکن زمین پر بسنے والے انسان کے دل تک پہنچنے کا راستہ بھول گئے۔ شعور کے بغیر علم ایک ایسی شمع ہے جو دوسروں کو تو راستہ دکھا سکتی ہے، مگر اسے رکھنے والا خود اندھیرے میں رہتا ہے۔

خلاصہ کلام

علم ایک بیج ہے اور شعور وہ درخت جو اس بیج سے پھوٹتا ہے۔ اگر بیج سے تناور اور سایہ دار درخت نہ بنے، تو بیج کا ہونا بے معنی ہے۔ ہمیں اپنی نسلوں کو صرف کتابیں رٹوانا نہیں، بلکہ ان میں احساس کی تڑپ پیدا کرنی ہوگی۔ شعور وہ روشنی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ اصل ترقی مادی اشیاء کی جمع آوری نہیں، بلکہ انسانیت کی فلاح ہے۔ جس دن ہم نے علم کو اپنی انا کی تسکین کے بجائے روح کی بالیدگی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا، اس دن ہماری زندگی میں حقیقی شعور کا سویرا ہوگا۔

محبت ایک عبادت تھی، ہم نے اسے کاروبار بنا دیا
محبت کا تقدس اور ہماری روش
محبت کائنات کا وہ جوہر ہے جس کی بنیاد بے غرضی اور ایثار پر رکھی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی عبادت تھی جس میں "میں" کو مٹا کر "تو" کو پانا مقصود تھا۔ لیکن افسوس کہ وقت کی رفتار اور مادہ پرستی کی دوڑ نے اس پاکیزہ جذبے کے معنی ہی بدل دیے۔ آج محبت دلوں کا معاملہ کم اور ضرورتوں کا سودا زیادہ نظر آتی ہے۔ ہم نے جذبوں کے اس پاکیزہ رشتے کو بھی "دنیاوی چکی" میں ڈال کر ایک تجارتی شکل دے دی ہے۔
شرائط اور تقاضوں کی بھینٹ
قدیم دور میں محبت قربانی مانگتی تھی، آج کے دور میں محبت "فائدہ" مانگتی ہے۔ ہم نے محبت کے گرد شرائط کی ایسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں کہ اب کوئی بھی رشتہ بغیر کسی مفاد کے قائم نہیں ہوتا۔ چاہے وہ دوستی ہو، رشتہ داری ہو یا ازدواجی تعلق، ہر جگہ پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ "مجھے اس سے کیا ملے گا؟"۔ جہاں لین دین کا حساب شروع ہو جائے، وہاں سے عبادت رخصت ہو جاتی ہے اور کاروبار کا آغاز ہوتا ہے۔

ڈیجیٹل محبت اور نمائش

آج کل محبت کا معیار سوشل میڈیا کی پوسٹس اور مہنگے تحائف بن چکے ہیں۔ ہم اپنے جذبات کا اظہار ایک دوسرے سے زیادہ دنیا کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ محبت جو کبھی خاموشی اور رازداری کا نام تھی، اب شور و غل اور نمائش میں تبدیل ہو گئی ہے۔ جب جذبے دکھاوے کی نذر ہو جائیں، تو ان کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ ہم نے لفظوں کی جادوگری تو سیکھ لی، لیکن خاموش نگاہوں کی زبان سمجھنا بھول گئے، کیونکہ کاروبار میں زبان چلتی ہے، دل نہیں۔

خلوص پر مادیت کا غلبہ

ہم نے رشتوں کو مادی ترازو میں تولنا شروع کر دیا ہے۔ اب ہم کسی انسان کی قدر اس کے اخلاق یا اس کی محبت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کے بینک بیلنس، اس کی گاڑی اور اس کے سماجی رتبے کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں ہم اپنی روح بیچ کر عارضی سکون خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے پاس سہولیات تو بہت ہیں، لیکن وہ سکونِ قلب میسر نہیں جو بے غرض محبت کی چھاؤں میں ملتا تھا۔

نتیجہ فکر

محبت کو دوبارہ عبادت کے درجے پر لانے کے لیے ہمیں "حساب کتاب" کی عادت چھوڑنی ہوگی۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ رشتوں میں نفع اور نقصان نہیں دیکھا جاتا بلکہ صبر اور شکر دیکھا جاتا ہے۔ جب تک ہم محبت کو انا اور مفاد کی قید سے آزاد نہیں کریں گے، ہم اس دنیاوی چکی میں پِستے رہیں گے اور ہمارے ہاتھ صرف پچھتاوے آئیں گے۔ محبت تو وہ بادل ہے جو بن مانگے برستا ہے، اور جو برسنے کے عوض قیمت مانگے وہ بادل نہیں، ایک سوداگر ہے۔

ہم نے خدا کو مسجد میں بند کر دیا

عبادت اور زندگی کی تقسیم

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے دین اور دنیا کو دو الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خدا صرف مسجد کی چار دیواری کے اندر موجود ہے، جہاں ہم ماتھا ٹیک کر اپنی ذمہ داری پوری کر لیتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ہم مسجد کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہیں، ہمارا خدا بدل جاتا ہے، ہمارے قوانین بدل جاتے ہیں اور ہمارا رویہ بدل جاتا ہے۔ ہم نے خدا کو ایک مخصوص جگہ تک محدود کر کے اپنی باقی زندگی کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

مسجد میں پارسائی، بازار میں بے حسی

مسجد کی صفوں میں کھڑے ہو کر ہم تقویٰ کے بلند ترین درجے پر نظر آتے ہیں، لیکن وہی ہاتھ جو خدا کے سامنے پھیلے ہوتے ہیں، بازار میں ناپ تول میں کمی کرتے ہوئے نہیں ہچکچاتے۔ جو زبان مسجد میں تسبیح پڑھتی ہے، وہی باہر نکل کر دوسروں کی غیبت اور تضحیک میں مصروف ہو جاتی ہے۔ یہ اس "دنیاوی چکی" کا وہ خطرناک موڑ ہے جہاں ہم نے مذہب کو صرف ایک "پارٹ ٹائم" مشغلہ بنا لیا ہے۔ ہم بھول گئے ہیں کہ جو خدا مسجد میں سجدہ مانگتا ہے، وہی خدا بازار میں دیانتداری اور سڑک پر اخلاق بھی مانگتا ہے۔

روحانیت کے بغیر رسومات

ہم رسومات کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ہمیں عبادت کی روح کا ادراک ہی نہیں رہا۔ ہم سجدہ تو کرتے ہیں مگر ہمارا دل انا، کینہ اور نفرت سے بھرا ہوتا ہے۔ ہم نے سمجھ لیا ہے کہ شاید چند منٹ کی عبادت ہمارے پورے دن کے گناہوں کا لائسنس ہے۔ ہم نے خدا کو ایک "قاضی" تو مانا ہے جو صرف سزا یا جزا دیتا ہے، اسے وہ "رقیب" یا "ساتھی" نہیں مانا جو ہماری شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور جو کائنات کے ہر ذرے میں جلوہ گر ہے۔

خدا صرف جگہوں میں نہیں، رویوں میں ہے

خدا کو مسجد سے نکال کر اپنی زندگی کے ہر لمحے میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ خدا جو سجدہ گاہ میں معتبر ہے، وہی خدا غریب کی جھونپڑی میں، بیوہ کی پکار میں، اور یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے میں بھی موجود ہے۔ جب تک ہم یہ نہیں سمجھیں گے کہ ہر انسان کی خدمت اور ہر جاندار کے ساتھ نرمی بھی خدا کی تلاش کا ایک راستہ ہے، تب تک ہماری عبادتیں صرف جسمانی ورزش سے زیادہ کچھ نہیں ہوں گی۔

نتیجہ فکر
ہمیں اپنے عقیدے کی بنیادوں کو دوبارہ ٹٹولنا ہوگا۔ خدا کو مسجد میں بند کرنا دراصل اپنی روح کو قید کرنا ہے۔ اصل بندگی یہ ہے کہ جب ہم مسجد سے باہر نکلیں تو ہمارے کردار سے خدا کی خوشبو آئے۔ ہماری دکان، ہمارا دفتر، ہمارا گھر اور ہمارا راستہ بھی سجدہ گاہ بن جائے جہاں ہم اللہ کے احکامات کی پاسداری کریں۔ کائنات کی اس وسیع مسجد میں خدا ہر جگہ موجود ہے، بس ہمیں اپنی آنکھیں اور دل کھولنے کی ضرورت ہے۔

انسان کو انسان سے ڈر لگنے لگا ہے

بڑھتا ہوا عدم اعتماد

تاریخ میں انسان کو درندوں سے ڈر لگتا تھا، پھر اسے قدرتی آفات سے خوف آنے لگا، لیکن آج کا المیہ یہ ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ خطرہ خود انسان سے ہے۔ "دنیاوی چکی" نے ہمیں ایک ایسی دوڑ میں لگا دیا ہے جہاں ہر دوسرا شخص ہمارا حریف (Competitor) بن چکا ہے۔ اب ہم اجنبیوں سے تو دور کی بات، اپنوں سے بات کرتے ہوئے بھی محتاط رہتے ہیں کہ کہیں کوئی ہماری کمزوری کو ہمارے خلاف استعمال نہ کر لے۔

شہروں کا ہجوم اور تنہائی کا خوف

آج ہمارے شہروں میں آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کندھے سے کندھا چھلتا ہے، لیکن دلوں کے درمیان میلوں کی دوری ہے۔ ہم ایک ہی عمارت میں رہتے ہیں مگر پڑوسی کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے۔ اس بے حسی نے ایک ایسا خوف پیدا کر دیا ہے کہ اگر کوئی سڑک پر مدد کے لیے پکارے تو ہم یہ سوچ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ کہیں یہ کوئی "جال" نہ ہو۔ انسان کی ہمدردی پر شک کا غلبہ ہو چکا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت دم توڑنے لگتی ہے۔

مفاد پرستی کا زہر

خوف کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اب تعلقات کی بنیاد "خلوص" کے بجائے "مطلب" پر ہے۔ جب ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ سامنے والا شخص ہم سے صرف کسی فائدے کی خاطر مل رہا ہے، تو ہم اس سے ڈرنے لگتے ہیں۔ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ جب مطلب نکل جائے گا تو یہ شخص ہمیں کسی بند گلی میں چھوڑ دے گا۔ اس بے یقینی نے انسانوں کے درمیان سے "امن" چھین لیا ہے۔ ہم نے گھروں کے باہر تو لوہے کے دروازے اور کیمرے لگا لیے، لیکن دلوں میں لگے ہوئے خوف کے تالوں کا کوئی علاج نہیں کیا۔

مسکراہٹوں کے پیچھے چھپے چہرے

آج کے دور میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کون دوست ہے اور کون دشمن۔ منافقت نے وہ لبادہ اوڑھ لیا ہے کہ ہر شخص خیر خواہ نظر آتا ہے، مگر اندر حسد اور رقابت کی آگ جل رہی ہوتی ہے۔ انسان کو انسان سے اس لیے ڈر لگتا ہے کہ اب وار سامنے سے نہیں، پیٹھ پیچھے سے کیے جاتے ہیں۔ اخلاقیات کی گراوٹ نے ہمیں ایک ایسی جنگلاتی زندگی کی طرف دھکیل دیا ہے جہاں صرف وہی بچتا ہے جو دوسرے کو کچلنے کی طاقت رکھتا ہو۔

نتیجہ فکر

اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ خوف ختم ہو، تو ہمیں دوبارہ "اعتبار" کی فصل بونی ہوگی۔ ہمیں اپنی انا اور مفاد کی دیواریں گرا کر ایک دوسرے کے لیے دل کے دروازے کھولنے ہوں گے۔ خوف کا علاج صرف محبت اور سچائی ہے اور سچائی کی شروعات خود سے کرنی پڑتی ہے۔ جب ہم خود کسی کے لیے خوف کی علامت نہیں بنیں گے، تبھی ہمیں دوسروں سے ڈر لگنا بند ہوگا۔ ورنہ اس دنیاوی چکی میں پستا ہوا انسان ایک دن اتنا اکیلا ہو جائے گا کہ اسے اپنے سائے سے بھی ڈر آنے لگے گا۔

یہ دور ہمیں یاد کیوں نہیں رکھے گا؟

تاریخ کا بے رحم ترازو

تاریخ صرف ان ادوار کو یاد رکھتی ہے جنہوں نے انسانیت کے شعور میں کوئی گراں قدر اضافہ کیا ہو یا جن کے نقشِ قدم آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بنے ہوں۔ ہم جس دور میں جی رہے ہیں، اسے مادی ترقی کا عروج تو کہا جا سکتا ہے، لیکن روحانی اور اخلاقی لحاظ سے یہ دور بنجر ترین معلوم ہوتا ہے۔ "دنیاوی چکی" نے ہمیں اتنا سطحی بنا دیا ہے کہ ہماری کوئی بھی تخلیق یا عمل ایسا نہیں جو وقت کی گرد سے محفوظ رہ سکے۔

عارضی پن کا جنون

ہمارا سب سے بڑا المیہ "فوری تسکین" (Instant Gratification) کا حصول ہے۔ ہم ہر چیز ایسی بناتے ہیں جو بس آج کے لیے ہو۔ ہماری تحریریں سوشل میڈیا کی پوسٹس تک محدود ہیں جو چند گھنٹوں میں غائب ہو جاتی ہیں، ہماری گفتگو واٹس ایپ کے پیغامات کی طرح حذف کر دی جاتی ہے، اور ہمارے رشتے "یوز اینڈ تھرو" (Use and Throw) کی بنیاد پر ہیں۔

جب کسی دور کی بنیاد ہی پائیداری کے بجائے نمائش اور عارضی پن پر ہو، تو تاریخ اسے اپنے سینے میں جگہ نہیں دیتی۔

تخلیق کا فقدان اور نقل کی کثرت

آج کا انسان "خالق" (Creator) سے زیادہ "صارف" (Consumer) بن چکا ہے۔ ہم دوسروں کے خیالات کو کاپی کرتے ہیں، دوسروں کے طرزِ زندگی کی نقل کرتے ہیں اور دوسروں کی بنائی ہوئی ٹیکنالوجی کے غلام ہیں۔ جس دور میں اپنا کوئی فلسفہ نہ ہو، کوئی نئی فکر نہ ہو اور کوئی ایسا کردار نہ ہو جو حق کے لیے تنہا کھڑا ہو سکے، وہ دور تاریخ کے پنوں میں صرف ایک "شور" بن کر رہ جاتا ہے۔ ہم نے عمارتیں تو بلند کر لیں، لیکن انسان بونے رہ گئے۔

احساسِ ذمہ داری سے عاری نسل

تاریخ ان قوموں کو یاد رکھتی ہے جنہوں نے زمین کو آنے والی نسلوں کے لیے بہتر بنایا۔ ہم نے تو زمین کے وسائل کو بے دردی سے لوٹا، ماحول کو آلودہ کیا اور اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا۔ ہم نے اپنی اولاد کو وراثت میں بینک بیلنس تو دیا، لیکن "روایات" اور "تہذیب" دینا بھول گئے۔ ایک ایسی نسل جو صرف اپنے بارے میں سوچتی ہو اور جس کا مقصد صرف ذاتی آسائش ہو، وہ کبھی مثالی یادگاریں نہیں چھوڑ سکتی۔

نتیجہ فکر

اگر ہم چاہتے ہیں کہ تاریخ ہمیں یاد رکھے، تو ہمیں "سستی شہرت" کی چکی سے باہر نکلنا ہوگا۔ ہمیں ایسے کام کرنے ہوں گے جن کی جڑیں زمین میں گہری اور شاخیں آسمان تک ہوں—یعنی ایسے کام جن کا فائدہ انسانیت کو نسل در نسل پہنچے۔ جب تک ہم مادیت کی قید سے نکل کر روح اور کردار کی عظمت پر توجہ نہیں دیں گے، ہم تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکے گئے اس کباڑ کی طرح ہوں گے جس کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہتا۔

ہم سوال پوچھنے سے کیوں ڈرتے ہیں؟

خاموشی کا جبر اور سماجی دباؤ

سوال زندہ ذہن کی علامت ہے، لیکن ہماری "دنیاوی چکی" نے ہمیں ایک ایسی خاموش بھیڑ میں بدل دیا ہے جو صرف سر ہلانا جانتی ہے۔ ہم بچپن سے ہی ایک ایسے نظام کا حصہ بن جاتے ہیں جہاں سوال کو گستاخی اور خاموشی کو ادب سمجھا جاتا ہے۔ گھر ہو، اسکول ہو یا معاشرہ، ہر جگہ ہمیں "بنے بنائے راستوں" پر چلنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ جب کوئی ذہن سوال کرنا چھوڑ دیتا ہے، تو اس کی تخلیقی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں اور وہ صرف ایک روبوٹ بن کر رہ جاتا ہے۔

عقیدت اور اندھی تقلید کا خوف

ہم سوال پوچھنے سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمیں "باغی" یا "گستاخ" نہ قرار دے دیا جائے۔ ہم نے شخصیات، نظریات اور روایات کے گرد تقدس کے ایسے حصار باندھ دیے ہیں کہ ان پر سوال اٹھانا ایک جرم بن چکا ہے۔ شعور کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم حقائق کو جانچتے، لیکن ہم نے اندھی تقلید میں سکون تلاش کر لیا ہے۔ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ اگر ہم نے سوال کیا تو وہ بت ٹوٹ جائیں گے جن کی ہم برسوں سے پوجا کر رہے ہیں، چاہے وہ بت سیاسی ہوں، مذہبی ہوں یا سماجی۔

رد کیے جانے کا ڈر

انسان فطرتی طور پر معاشرے کا حصہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ سوال پوچھنے والا اکثر اکیلا رہ جاتا ہے کیونکہ وہ رائج وقت کے جھوٹ کو بے نقاب کرتا ہے۔ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ اگر ہم نے سچ جاننے کی کوشش کی یا مروجہ نظام کو چیلنج کیا، تو ہمیں برادری، دوستوں اور خاندان سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ اس "سوشل بائیکاٹ" کے خوف نے کروڑوں زبانوں پر تالے لگا دیے ہیں اور ہم ایک ایسے معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں سچ سب کو معلوم ہے مگر بولتا کوئی نہیں۔

جہالت میں عافیت کا وہم

کبھی کبھی ہم سوال اس لیے نہیں پوچھتے کیونکہ ہم سچ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ سوال ہمیں بے چین کر دیتا ہے، یہ ہمیں اپنی آرام گاہوں (Comfort Zones) سے باہر نکلنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ "کم جاننا" ہی سکون کا راستہ ہے، حالانکہ یہ سکون نہیں بلکہ ایک ذہنی غلامی ہے۔ دنیاوی چکی ہمیں اتنا تھکا دیتی ہے کہ ہم سچ کی تلاش کی مشقت اٹھانے کے بجائے جھوٹ کی چھاؤں میں سونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

نتیجہ فکر

سوال وہ کنجی ہے جو بند ذہنوں کے دروازے کھولتی ہے۔ جب تک کوئی قوم سوال کرنے کی جرات نہیں کرتی، وہ ارتقاء کی منازل طے نہیں کر سکتی۔ ہمیں اپنے بچوں کو یہ سکھانا ہوگا کہ سوال کرنا بے ادبی نہیں بلکہ علم کا پہلا زینہ ہے۔ یاد رکھیے، وہی معاشرے ترقی کرتے ہیں جہاں فکر پر پہرے نہیں ہوتے اور جہاں ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ "کیوں" اور "کیسے" پوچھ سکے۔ جس دن ہمارا خوف ختم ہو جائے گا، اسی دن سے ہماری ذہنی آزادی کا آغاز ہوگا۔

جو لکھتا ہے، وہ اکیلا کیوں ہوتا ہے؟

تخلیق کار کی تنہائی

لکھنا محض کاغذ پر روشنائی بکھیرنے کا نام نہیں، بلکہ یہ اپنے اندر کے غار میں اتر کر سچائی کی تلاش کا عمل ہے۔ جو لکھتا ہے، وہ عام لوگوں کی طرح صرف سطح پر نہیں دیکھتا بلکہ وہ زندگی کے سمندر میں غوطہ لگا کر گہرائی میں موجود حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس عمل میں وہ اکثر ہجوم سے کٹ جاتا ہے۔ دنیاوی چکی کا حصہ بنے ہوئے لوگ مادی مفادات کی باتیں کرتے ہیں، جبکہ لکھنے والا روح کے زخموں اور سماج کے چھپے ہوئے ناسوروں کی بات کرتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی تنہائی شروع ہوتی ہے۔

مشاہدے کا عذاب

لکھنے والا ایک حساس آنکھ رکھتا ہے۔ وہ ان باتوں پر تڑپ اٹھتا ہے جنہیں عام لوگ دیکھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب وہ معاشرے میں ناانصافی، جھوٹ اور منافقت کو دیکھتا ہے تو وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس کا قلم اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ چونکہ وہ بھیڑ کا حصہ بن کر "جی حضوری" نہیں کر پاتا، اس لیے معاشرہ اسے "اجنبی" سمجھنے لگتا ہے۔ لوگ اسے پاگل، باغی یا انتہا پسند قرار دے کر تنہا چھوڑ دیتے ہیں، کیونکہ وہ ان کے جھوٹے سکون میں اپنی سچائی سے خلل ڈالتا ہے۔

اپنوں کے درمیان بیگانگی

ایک لکھنے والے کی سب سے بڑی اذیت یہ ہے کہ وہ اپنوں کے درمیان رہ کر بھی اکیلا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی زبان بولتا ہے جو احساس کی ہوتی ہے، جبکہ اس کے ارد گرد لوگ صرف ضرورت کی زبان سمجھتے ہیں۔ جب وہ اپنی تحریر میں اپنے خون کا رنگ بھرتا ہے، تو لوگ اسے صرف ایک "اچھا جملہ" سمجھ کر واہ واہ کرتے ہیں، کوئی اس کرب کو نہیں دیکھتا جس سے وہ تحریر گزری ہوتی ہے۔ یہ عدمِ تفہیم اسے اپنے ہی گھر اور معاشرے میں ایک جزیرہ بنا دیتی ہے۔

تنہائی: لکھنے والے کی ضرورت

اگرچہ یہ تنہائی تکلیف دہ ہے، لیکن یہ لکھنے والے کی ضرورت بھی ہے۔ شور میں کبھی فکر جنم نہیں لیتی۔ ایک سچا تخلیق کار اپنی تنہائی میں ہی کائنات سے ہم کلام ہوتا ہے۔ وہ جب اکیلا ہوتا ہے، تبھی وہ ان آوازوں کو سن پاتا ہے جو دنیا کے ہنگاموں میں دب جاتی ہیں۔ اس کی تنہائی دراصل اس کی طاقت ہوتی ہے، جہاں وہ اپنے کرداروں کو تراشتا ہے اور اپنے نظریات کو جلا بخشتا ہے۔ وہ دنیا سے اس لیے کٹتا ہے تاکہ وہ دنیا کو ایک نیا آئینہ دکھا سکے۔

نتیجہ فکر

جو لکھتا ہے، وہ اس لیے اکیلا ہوتا ہے کیونکہ وہ سچ کی قیمت چکا رہا ہوتا ہے۔ سچ ہمیشہ سے اکیلا رہا ہے اور اس کے راہی بھی ہمیشہ سے کم ہی رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے، لکھنے والے کی یہ وقتی تنہائی اسے ابدی زندگی بخشتی ہے۔ ہجوم مٹ جاتا ہے، تالیاں بجانے والے مر جاتے ہیں، لیکن جو لفظ سچائی کی تنہائی میں لکھے جاتے ہیں، وہ تاریخ کے ماتھے پر جھومر بن کر چمکتے ہیں۔ لکھنے والے کا اکیلا پن دراصل اس کی عظمت کی گواہی ہے۔

قلم عبادت ہے یا ہنر؟
قلم کی حرمت اور ذمہ داری
قلم محض لکڑی یا پلاسٹک کا ایک ٹکڑا نہیں ہے، بلکہ یہ وہ پہلا لفظ ہے جس کی قسم خالقِ کائنات نے کھائی۔ انسانی تاریخ میں قلم نے وہ انقلاب برپا کیے جو بڑی بڑی تلواریں اور توپیں نہ کر سکیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا لکھنا محض ایک "ہنر" (Skill) ہے جس کے ذریعے شہرت اور دولت کمائی جائے، یا یہ ایک "عبادت" ہے جس کے ذریعے حق کا پیغام عام کیا جائے؟ "دنیاوی چکی" میں پسنے والے اس دور میں قلم کی شناخت کا یہ سوال نہایت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔
قلم بطورِ ہنر: ایک تجارتی نقطہ نظر
جب قلم صرف ایک ہنر بن جاتا ہے، تو یہ بازار کی ضرورت کے مطابق لکھتا ہے۔ ایک ہنرمند کاتب یا مصنف وہ دیکھتا ہے کہ لوگ کیا پڑھنا چاہتے ہیں، نہ کہ وہ جو لوگوں کو پڑھنا چاہیے۔ یہاں قلم بکنے لگتا ہے، یہ طاقتور کی مدح سرائی کرتا ہے اور مفاد کے لیے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرتا ہے۔ جب لکھنا صرف فنکاری بن جائے تو اس میں لفظوں کی جادوگری تو ہوتی ہے، مگر ان میں روح کی تڑپ اور تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا قلم صرف پیٹ بھرنے کا ذریعہ تو بن سکتا ہے، مگر تاریخ بدلنے کا نہیں ہنر نہیں۔

قلم بطورِ عبادت: حق گوئی کا سفر

قلم جب عبادت بنتا ہے، تو یہ ضمیر کی آواز بن جاتا ہے۔ عبادت گزار قلم کار اپنے لفظوں کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے۔ وہ سچ لکھتے ہوئے یہ نہیں دیکھتا کہ وقت کا سلطان کتنا طاقتور ہے یا معاشرہ اس کی مخالفت کرے گا۔ اس کے لیے لکھنا ایک فریضہ ہے، ایک ایسی دعا ہے جو وہ انسانیت کی فلاح کے لیے کرتا ہے۔ جب قلم عبادت بنتا ہے، تو یہ مظلوم کی ڈھال اور ظالم کے خلاف ننگی تلوار بن جاتا ہے۔ اس راستے میں مصلحت نہیں ہوتی، بلکہ صرف حق کی تلاش ہوتی ہے۔

تاثیر کا راز

ہنر سیکھا جا سکتا ہے، لیکن تاثیر عطا کی جاتی ہے۔ دنیا میں لاکھوں لوگ لکھنے کا ہنر جانتے ہیں، لیکن تاریخ کے سینے پر صرف ان کے نام نقش ہیں جن کے قلم میں سچائی کی تڑپ تھی۔ ہنر سے لکھی گئی تحریریں صرف دماغ تک پہنچتی ہیں اور واہ واہ کرواتی ہیں، لیکن عبادت سمجھ کر لکھی گئی تحریریں دلوں کی بنجر زمین کو سیراب کرتی ہیں اور انسانوں کی زندگی بدل دیتی ہیں۔ قلم کی اصل معراج یہ ہے کہ وہ انسان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔

نتیجہ فکر

قلم کو ہنر کے طور پر استعمال کرنا برا نہیں، لیکن اسے صرف ہنر تک محدود کر دینا قلم کی توہین ہے۔ ایک سچے لکھاری کے لیے قلم ہنر بھی ہے اور عبادت بھی۔ ہنر اسے سلیقہ سکھاتا ہے اور عبادت اسے مقصد عطا کرتی ہے۔ ہمیں اس دنیاوی چکی سے بچنے کے لیے اپنے قلم کو دوبارہ اس کا کھویا ہوا تقدس لوٹانا ہوگا۔ جس دن ہم نے قلم کو خدا کی امانت سمجھ کر استعمال کرنا شروع کر دیا، اس دن ہمارے لفظوں میں وہ طاقت پیدا ہو جائے گی جو مردہ قوموں میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔

اختتامیہ (شکریہ)

کتاب کے ان آخری الفاظ تک پہنچتے ہوئے، میں اللہ رب العزت کا شکر گزار ہوں جس نے میرے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو ترتیب دینے کی توفیق عطا کی۔ یہ سفر یہاں ختم نہیں ہوتا، بلکہ یہاں سے ایک نئی سوچ کا آغاز ہوتا ہے۔ میں ان تمام لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ میرا ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ اگر ان تحریروں سے کسی ایک انسان کے دل میں بھی اپنی اصلاح کی تڑپ پیدا ہو گئی، تو میں سمجھوں گا کہ میرا قلم اپنی عبادت میں کامیاب رہا۔ یاد رکھیے، دنیاوی چکی تب تک پیستی ہے جب تک ہم اس کے مرکز (خدا اور سچائی) سے دور رہتے ہیں۔ جس دن ہم مرکز سے جڑ گئے، اس دن یہ چکی ہمیں پیسنا چھوڑ دے گی۔

پبلش تاریخ

5 جنوری 2026

پبلشر

ابو موسیٰ لاہور پاکستان